ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1903

Program:

Semester: Autumn 2026

ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY, ISLAMABAD

Course: Tarikh-e-Islam-1 (1903) • Level: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

Assignment No. 2 (Units 5–9)

SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

(For Study & Reference)

Note: This guide is prepared for study and rererence purposes. Students are advised to read the relevant units of the course book, understand the concepts, and then write the assignment in their own words.

نوٹ :یہ حل شدہ گائیڈ صرف مطالعے اور رہنمائی کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ متعلقہ یونٹس کا مطالعہ کر کے مفاہیم کو سمجھیں اور پھر امتحانی مشق اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

سوال نمبر 1 (20 نمبر)

سوال نمبر :1 نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل دنیا کی مذہبی حالت کا جائزہ لیں۔

تعارف

انسان فطرتاً مذہبی ہے اور مذہب اس کی زندگی میں ہمیشہ رہنما کی حیثیت رکھتا آیا ہے، لیکن جب اصل وحی کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے تو مذہب خرافات اور رسومات کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی بعثت، جو610 ء میں ہوئی، سے پہلے دنیا کے تمام بڑے مذاہب اپنی اصل صورت کھو چکے تھے۔ عرب بت پرستی میں ڈوبا ہوا تھا، عیسائیت داخلی اختلافات اور تحریف کا شکار تھی، یہودیت قومی خود پرستی میں بدل گئی تھی، فارس میں مجوسیت کی تاریکی

تھی اور ہندوستان میں مذہب ذات پات اور رسم و رواج کی قید میں تھا۔ اس جواب میں دنیا کی اسی مذہبی حالت کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

یہ جائزہ اس لیے ضروری ہے کہ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کیوں اس وقت کی سب سے بڑی انسانی ضرورت تھا۔ جب انسان اپنے بنائے ہوئے بتوں کے آگے جھکنے لگے، مذہبی پیشوا دولت و اقتدار کے غلام بن جائیں اور سچائی کے متلاشیوں کے لیے کوئی واضح راستہ باقی نہ رہے تو بعثت نبوی ہی وہ شمع ہے جو اس تاریکی کو دور کرتی ہے۔

جزیرہ نما عرب کی مذہبی حالت

عرب اصل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین حنیف کے وارث تھے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ بت پرستی نے پورے جزیرہ نما کو گھیر لیا۔ اس کی ابتدا عمرو بن لحی سے ہوئی جس نے شام سے بت لا کر کعبہ میں نصب کیے۔ آہستہ آہستہ ہر قبیلے کا اپنا بت بن گیا؛ قریش کا ہبل، ثقیف کا لات، اوس و خزرج کا منات اور دوسرے قبائل کے عزیٰ وغیرہ بت خانہ کعبہ کے گرد بھی تین سو ساٹھ بت نصب تھے۔ جو کعبہ توحید کا مرکز تھا وہی شرک کا گڑھ بن گیا تھا۔

بت پرستی کے ساتھ نجوم پرستی، جنات و ارواح کی پرستش، کاہنوں سے فال لینا اور بدشگونی جیسی خرافات بھی عام تھیں۔ عرب اپنے مردوں کے نام پر قربانیاں کرتے، بتوں کے آگے سجدے کرتے اور اپنے بچوں تک کو بتوں کے نام منسوب کرتے تھے، جیسے عبد العزیٰ و عبد مناف کے ناموں سے ظاہر ہے۔ اس کے باوجود عربوں میں اللہ کے وجود کا عقیدہ موجود تھا؛ قرآن کے مطابق جب ان سے پوچھا جاتا کہ زمین و آسمان کا خالق کون ہے تو وہ اللہ ہی کہتے تھے، مگر عبادت میں بتوں کو شریک ٹھہراتے اور انہیں سفارشی سمجھتے تھے۔

عرب میں دیگر مذاہب کے پیروکار بھی موجود تھے۔ یثرب) مدینہ (اور خیبر وغیرہ میں یہودی قبائل آباد تھے، نجران اور سرحدی علاقوں میں عیسائی موجود تھے اور کچھ علاقوں میں مجوسی اثرات بھی پائے جاتے تھے۔ ان سب سے بڑھ کر ایک چھوٹی سی جماعت' حنفاء 'کی تھی جو بت پرستی سے بیزار ہو کر دین ابراہیمی کی تلاش میں تھے، جن میں ورقہ بن نوفل، زید بن عمرو بن نفیل اور قس بن ساعدہ جیسے لوگ شامل تھے۔ یہ حنفاء اس بات کا ثبوت تھے کہ فطرت انسانی شرک سے مطمئن نہیں ہوتی اور سچائی کی جستجو مسلسل جاری رہتی ہے۔

یہودیت اور عیسائیت کی حالت

یہودیوں کے پاس تورات موجود تھی لیکن انہوں نے اس میں تحریف کر دی تھی، مذہب کو نسل و قوم کی ملکیت بنا لیا تھا اور خود کو اللہ کے چہیتے سمجھ کر دوسری اقوام کو حقیر جانتے تھے۔ ان کے علما نے حلال و حرام کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے اور دنیا پرستی ان میں اس قدر غالب تھی کہ قرآن نے انہیں ربانیوں اور احبار کی دنیا سے محبت پر تنقید کا نشانہ بنایا۔ نبوت کی بشارتیں موجود ہونے کے باوجود قومی تعصب نے انہیں حق کی پہچان سے محروم رکھا تھا۔

عیسائیت کا حال بھی مختلف نہ تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیم توحید تھی، لیکن بعد میں تثلیث کا عقیدہ رائج ہوا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا گیا اور چرچ نے مذہب پر مکمل اجارہ داری قائم کر لی۔ عقائد کے اختلافات پر فرقے ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے اور ان اختلافات پر خونریزیاں ہوتی تھیں۔ پادریوں کی طبقہ بندی، گناہوں کی معافی کے سرٹیفکیٹ، رہبانیت کی بدعتیں اور مذہب کے نام پر علم و تحقیق پر پابندیوں نے عیسائی دنیا کو اندھیروں میں دھکیل دیا تھا۔ رومی شہنشاہ نے مذہب کو سیاست کا آلہ بنا رکھا تھا، چنانچہ عام عیسائی بھی اس صورتحال سے بیزار تھا۔

فارس کی مجوسیت اور دیگر مذاہب

فارس کا سرکاری مذہب مجوسیت) زرتشتیت (تھا جس میں آگ کی پرستش کی جاتی تھی اور دنیا کو دو خداؤں، یزداں)نور و خیر کا خالق (اور اہرمن) ظلمت و شر کا خالق(، کی کشمکش کا میدان سمجھا جاتا تھا۔ یہ دوئی کا عقیدہ توحید سے کوسوں دور تھا۔ آتش کدے ہر شہر میں موجود تھے اور موبد) مذہبی پیشوا (بادشاہ کے ساتھ اقتدار میں شریک تھے۔ بعد میں مزدک نے ایک نیا فتنہ کھڑا کیا جس نے مال و عورت کی اشتراکیت کی تعلیم دے کر معاشرے کی بنیادیں ہلا دیں اور اس کے رد عمل میں سخت جبر کا دور آیا۔

ہندوستان میں مذہبی حالت انتہائی پیچیدہ تھی۔ بے شمار دیوتاؤں کی پرستش، ذات پات کا ظالمانہ نظام، جس میں شودر کو انسانیت سے گرا ہوا سمجھا جاتا تھا، بیواؤں کی ستی کی رسم اور مذہبی اجارہ داری برہمنوں کے ہاتھ میں تھی۔ بدھ مت اصل میں اخلاقی اصلاح کی تحریک تھی لیکن بعد میں وہ بھی بت پرستی اور خانقاہی نظام میں بدل گیا۔ چین

میں کنفیوشس کی اخلاقی تعلیمات اور تاؤ ازم رائج تھے لیکن روحانی تسکین کا سامان وہاں بھی ناپید تھا۔ یہودیت سے لے کر مجوسیت تک ہر مذہب میں مذہبی پیشوائیت، رسوم پرستی اور تحریف مشترک قدر تھی۔

مذہبی بگاڑ کے مشترک اسباب و نتائج

اس عالمی مذہبی زوال کے چند مشترک اسباب نظر آتے ہیں۔ پہلا سبب اصل کتب اور وحی میں تحریف اور اس کا ضیاع تھا۔ دوسرا سبب مذہبی پیشواؤں کا دنیاوی مفادات سے جڑ جانا تھا، جس نے مذہب کو اصلاح کے بجائے اقتدار و دولت کا ذریعہ بنا دیا۔ تیسرا سبب عقیدے کو فلسفیانہ موشگافیوں اور فرقہ وارانہ جھگڑوں میں الجھا دینا تھا۔ چوتھا سبب یہ تھا کہ مذہب صرف رسومات رہ گیا تھا اور اس کا اخلاق و کردار سے رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔

ان اسباب کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام انسان مذہب سے بیزار ہونے لگا اور روحانی خلا بڑھتا گیا۔ سچے متلاشی بیابانوں اور خانقاہوں میں پناہ لینے لگے، جیسا کہ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ظاہر کرتا ہے جو حق کی تلاش میں در در پھرتے رہے یہاں تک کہ مدینہ پہنچ کر منزل پائی۔ انسانیت اجتماعی طور پر ایک ایسے نبی کی منتظر تھی جو اصل توحید کو بحال کرے، مذہب کو رسومات سے نکال کر زندگی کا نظام بنائے اور تمام انسانوں کے لیے بلاتفریق ہدایت لائے۔ بعثت محمدی ﷺ اسی انتظار کا جواب تھی۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ بعثت سے قبل دنیا کی مذہبی حالت انتہائی زوال پذیر تھی :عرب شرک و بت پرستی میں مبتلا تھا، یہودیت قومی تعصب اور تحریف کا شکار تھی، عیسائیت تثلیث اور کلیسائی اجارہ داری میں الجھی تھی، فارس دوئی اور آتش پرستی میں گم تھا اور ہندوستان ذات پات و کثرت پرستی کا میدان تھا۔ کوئی مذہب انسان کو خدا سے جوڑنے اور زندگی کی مکمل رہنمائی دینے کی حالت میں نہ تھا۔ اسی تاریک ماحول میں اسلام نے توحید خالص، آخری وحی کی حفاظت کی ضمانت اور دین کو مکمل ضابطہ حیات بنا کر پیش کیا، جس نے چند عشروں میں دنیا کی مذہبی تاریخ کا رخ بدل دیا۔

سوال نمبر 20) 2 نمبر(

سوال نمبر :2 حفاظتِ سیرت کے ذرائع کی اہمیت کو واضح کریں۔

تعارف

اسلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے بانی نبی کریم ﷺ کی زندگی محفوظ ترین تاریخی ریکارڈ رکھتی ہے۔ دنیا کے کسی مذہبی پیشوا کی زندگی اس تفصیل اور تصدیق کے ساتھ محفوظ نہیں جس طرح حضور ﷺ کی سیرت محفوظ ہے؛ آپ ﷺ کی پیدائش سے وفات تک، سفر و حضر، جنگ و امن، خلوت و جلوت، غرض ہر حالت کے واقعات سند کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ حفاظت خودبخود نہیں ہوئی بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے متعدد ذرائع پیدا فرمائے۔ اس جواب میں حفاظت سیرت کے اہم ذرائع اور ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی جائے گی۔

حفاظت سیرت سے مراد اور اس کی ضرورت

حفاظت سیرت سے مراد یہ ہے کہ حضور ﷺ کے اقوال، افعال، احوال اور واقعات کو اس طرح محفوظ رکھا جائے کہ بعد کی نسلوں تک بغیر کسی کمی و اضافے کے پہنچیں، اور اس میں اصل اور دخیل میں تمیز ممکن رہے۔ اس حفاظت کی ضرورت دو وجہ سے تھی۔ پہلی یہ کہ حضور ﷺ کی زندگی اسوہ حسنہ ہے اور نمونہ اگر محفوظ نہ رہے تو پیروی ممکن نہیں رہتی۔ دوسری یہ کہ قرآن کے احکام کی عملی تشریح سیرت ہی سے ہوتی ہے، لہٰذا سیرت کا تحفظ درحقیقت خود دین کا تحفظ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا وعدہ فرمایا اور سیرت کے لیے وہ اسباب پیدا کر دیے جن سے آپ ﷺ کی سنت و سیرت بھی زندہ رہی۔

قرآن مجید :سیرت کا اولین اور مستند ترین ذریعہ

حفاظت سیرت کا پہلا اور سب سے مضبوط ذریعہ خود قرآن مجید ہے۔ قرآن میں حضور ﷺ کی زندگی کے بنیادی واقعات اور آپ ﷺ کے اخلاق و دعوت کے اصول موجود ہیں۔ غزوہ بدر، احد، خندق، حدیبیہ، فتح مکہ اور تبوک جیسے واقعات کی جھلکیاں، آپ ﷺ کے اخلاق کی شہادت' وانک لعلی خلق عظیم'، آپ ﷺ کی رحمت للعالمینی، ہجرت کا تذکرہ، ازواج

مطہرات سے متعلق احکام اور آپ ﷺ کے اہل خانہ کے واقعات قرآن میں محفوظ ہیں۔ چونکہ قرآن قیامت تک محفوظ کتاب ہے، اس لیے سیرت کی بنیادی ساخت بھی اسی کے ساتھ محفوظ ہو گئی۔

قرآن کی اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ سیرت کی دیگر روایات کو پرکھنے کا معیار فراہم کرتا ہے۔ کوئی روایت اگر قرآن کے بیان سے ٹکراتی ہے تو محققین اس کی تحقیق کرتے ہیں۔ یوں قرآن سیرت کے لیے ضابطہ اور کسوٹی کی حیثیت رکھتا ہے، اور سیرت کی حفاظت کا نظام اسی منزل سے آغاز ہوتا ہے۔

احادیث، روایت کا نظام اور علم الرجال

حفاظت سیرت کا دوسرا عظیم ذریعہ احادیث نبویہ اور ان کی روایت کا منظم نظام ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ کے اقوال و افعال کو غیر معمولی اہتمام سے یاد رکھا، کیونکہ وہ اسے دین سمجھتے تھے۔ بعض صحابہ نے صحائف تحریر کیے، جیسے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کا 'الصحیفة الصادقة'۔ صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین نے یہ ذخیرہ اگلی نسلوں تک پہنچایا اور ہر روایت کے ساتھ اس کے راویوں کا سلسلہ) سند (بیان کرنے کا اہتمام کیا گیا۔

اسی سند کی بنیاد پر علم الرجال اور اسماء الرجال کا وہ عظیم الشان علم وجود میں آیا جس کی مثال دنیا کی کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ لاکھوں راویوں کے حالات، ان کی سچائی، حافظہ، پیدائش و وفات اور اساتذہ و شاگردوں کی تفصیل محفوظ کر لی گئی تاکہ ہر خبر کی تحقیق ہو سکے۔ اس نظام کی اہمیت یہ ہے کہ سیرت میں کوئی بات بغیر جانچ کے داخل نہیں ہو سکتی؛ محدثین نے ضعیف اور موضوع روایات کو الگ کر کے ذخیرہ سیرت کو محفوظ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ سولہ سو سال گزرنے کے باوجود آج بھی ایک طالب علم کسی واقعے کی سندی حیثیت جانچ سکتا ہے۔

صحابہ کرام کا عمل اور اجتماعی تواتر

تیسرا ذریعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عملی تسلسل ہے۔ سیرت صرف کتابوں میں نہیں بلکہ ایک پوری نسل کی زندگیوں میں محفوظ ہوئی۔ لاکھوں صحابہ نے جو کچھ حضور ﷺ سے دیکھا اور سنا، اسے اپنی زندگیوں میں عملاً نافذ کیا اور پھر یہ عمل نسل در نسل پھیلتا گیا۔ نماز کا طریقہ، اذان، حج کے مناسک، روزے کے احکام، یہ سب عملی تواتر کے ساتھ آج تک منتقل ہو رہے ہیں اور ان میں اختلاف ممکن نہیں رہا۔

اجتماعی حافظے کی اہمیت یہ ہے کہ جو بات ہزاروں لوگوں نے بیک وقت دیکھی اور عمل کیا ہو، اس میں اجتماعی جھوٹ ناممکن ہو جاتا ہے۔ غزوات کے مقامات، مساجد، مدینہ کی گلیاں، غار حرا اور جبل نور جیسے آثار بھی سیرت کے مادی شواہد کے طور پر محفوظ رہے۔ صحابہ نے دنیا کے مختلف ملکوں میں پھیل کر سیرت کو جغرافیائی وسعت بھی عطا کی، جس سے اس کی تصدیق مختلف مراکز سے ہوتی رہی۔

ابتدائی سیرت نگاری اور کتب سیرت

چوتھا ذریعہ باقاعدہ سیرت نگاری کی روایت ہے۔ پہلی صدی ہجری ہی میں عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور ابن شہاب زہری نے سیرت کے واقعات جمع کرنا شروع کر دیے تھے۔ دوسری صدی میں محمد بن اسحاق نے' السیرۃ والمغازی 'مرتب کی، جسے ابن ہشام نے تلخیص و تحقیق کے ساتھ پیش کیا۔ واقدی کی المغازی'، ابن سعد کی' الطبقات الکبریٰ'، بلاذری کی' انساب الاشراف 'اور طبری کی' تاریخ 'نے اس ذخیرے کو مزید وسیع کیا۔ بعد کے ادوار میں ابن کثیر کی' البدایہ والنہایہ'، قاضی عیاض کی' الشفا'، ابن القیم کی' زاد المعاد 'اور اردو میں شبلی نعمانی کی' سیرت النبی ﷺ اور سید سلیمان ندوی کی خدمات نے اس تسلسل کو قائم رکھا۔

ان کتابوں کی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے واقعات کو ترتیب زمانی کے ساتھ، اسباب و نتائج کے تجزیے کے ساتھ اور مکمل حوالوں کے ساتھ محفوظ کیا۔ سیرت نگاروں نے محض نقل پر اکتفا نہیں کیا بلکہ روایات کا موازنہ کر کے راجح صورت بھی بیان کی۔ یہ علمی روایت آج تک جاری ہے اور ہر دور میں نئی تحقیق سے سیرت کا ذخیرہ مزید مضبوط ہوتا گیا ہے۔

آج کے دور میں ان ذرائع کی اہمیت

حفاظت سیرت کے ذرائع کی اہمیت آج کے دور میں دوگنی ہو گئی ہے۔ ایک طرف مستشرقین اور مخالفین نے سیرت پر اعتراضات کیے، تو دوسری طرف انہی محفوظ ذرائع کی بنیاد پر علمی جوابات دیے گئے۔ مشہور مستشرقین تک نے اعتراف کیا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی زندگی دنیا کے کسی بھی تاریخی کردار کے مقابلے میں سب سے زیادہ دستاویزی شواہد رکھتی ہے۔ سیرت کے ذرائع کی مضبوطی ہی سے مسلمان نوجوان کو اپنے دین پر اعتماد حاصل ہوتا ہے اور وہ میڈیا کے دور میں پھیلائی گئی غلط بیانیوں کا جواب دے سکتا ہے۔

دوسری طرف امت کی عملی رہنمائی کا انحصار بھی اسی تحفظ پر ہے۔ فقہ، اخلاق، سیاست، معیشت اور خاندانی زندگی، ہر شعبے میں جب کوئی مسئلہ پیش آتا ہے تو علماء سیرت و سنت کے محفوظ ذخیرے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اگر یہ ذرائع نہ ہوتے تو اسلام بھی دیگر مذاہب کی طرح داستانوں کا مجموعہ بن جاتا۔ لہٰذا ان ذرائع کی حفاظت اور ان کا مطالعہ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ حفاظت سیرت کے ذرائع میں قرآن مجید، احادیث و سند کا نظام، علم الرجال، صحابہ کا عملی تواتر، ابتدائی و مسلسل سیرت نگاری اور مادی آثار شامل ہیں۔ ان ذرائع نے حضور ﷺ کی زندگی کو تاریخ کی سب سے محفوظ زندگی بنا دیا ہے۔ ان کی اہمیت یہ ہے کہ انہی کی بدولت اسوہ حسنہ آج بھی مکمل صورت میں امت کے سامنے ہے، قرآن کی عملی تفسیر ممکن ہے اور باطل اعتراضات کا علمی جواب دیا جا سکتا ہے۔ طالب علم کے لیے لازم ہے کہ وہ سیرت کا مطالعہ انہی مستند ذرائع سے کرے اور غیر مستند روایات سے اجتناب کرے۔

سوال نمبر 20) 3 نمبر(

سوال نمبر :3 جامع نوٹ لکھیں (1) :بنو ہاشم کا مقاطعہ (2) بیعتِ رضوان

تعارف

اس سوال میں سیرت کے دو اہم واقعات پر جامع نوٹ مطلوب ہے۔ بنو ہاشم کا مقاطعہ مکی دور کی ابتلاء کا سب سے سخت مرحلہ تھا، جس میں حضور ﷺ اور آپ کے خاندان کو تین سال تک سماجی و معاشی محاصرے میں رکھا گیا۔ بیعت رضوان مدنی دور کا وہ درخشاں واقعہ ہے جو صلح حدیبیہ کے پس منظر میں پیش آیا اور جسے قرآن مجید نے اللہ کی رضا اور فتح مبین کی خوشخبری سے نوازا۔ دونوں واقعات صبر، ایمان اور حکمت نبوی کے بہترین نمونے ہیں۔

حصہ اول :بنو ہاشم کا مقاطعہ — پس منظر و اسباب

جب قریش دیکھ چکے کہ انفرادی مظالم، لالچ اور پیش کشوں سے دعوت اسلام رک نہیں رہی اور حضرت حمزہ و عمر رضی اللہ عنہما جیسے بااثر افراد اسلام قبول کر چکے ہیں تو انہوں نے ایک سخت اجتماعی تدبیر اختیار کی۔ اس سے پہلے

قریش کے وفد ابو طالب کے پاس کئی مرتبہ جا چکے تھے کہ وہ اپنے بھتیجے کو دعوت سے روکیں، لیکن ابو طالب نے خاندانی حمیت اور شفقت کی بنا پر حضور ﷺ کی حفاظت سے انکار نہ کیا اور فرمایا کہ میں اپنی جان تک آپ ﷺ کی حفاظت کروں گا۔ اس ناکامی کے بعد قریش نے فیصلہ کیا کہ پورے خاندان کا دباؤ بڑھایا جائے۔

سات نبوی میں قریش کے سرداروں نے ایک تحریری معاہدہ) صحیفہ (تیار کیا جس پر تقریباً چالیس سرداروں کے دستخط تھے۔ اس صحیفے کی شرائط یہ تھیں :بنو ہاشم اور بنو مطلب سے کوئی شادی بیاہ نہیں کرے گا؛ ان سے کوئی خرید و فروخت نہیں کرے گا؛ ان سے ملنا جلنا، بات چیت اور میل جول مکمل طور پر بند رہے گا؛ یہ مقاطعہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک بنو ہاشم محمد ﷺ کو قریش کے حوالے نہ کر دیں۔ یہ صحیفہ کعبہ کے اندر لٹکا دیا گیا تاکہ اسے مذہبی تقدس حاصل ہو اور اس کی خلاف ورزی گناہ سمجھی جائے۔

شعب ابی طالب کے تین سال

اس مقاطعے کے بعد بنو ہاشم اور بنو مطلب، مسلمان اور غیر مسلم سب، ابو طالب کی قیادت میں مکہ کی گھاٹی شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے۔ ابو طالب نے حضور ﷺ کی حفاظت کا غیر معمولی انتظام کیا؛ رات کو آپ ﷺ کا بستر تبدیل کر دیا جاتا اور خاندان کے افراد پہرہ دیتے۔ محاصرہ اتنا سخت تھا کہ کھانے پینے کی کوئی چیز گھاٹی تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اہل شعب پتوں اور چمڑے کے ٹکڑوں پر گزارہ کرتے، بچوں کے رونے کی آوازیں باہر تک سنائی دیتیں اور بھوک سے لوگوں کی کمر جھک گئی۔

اس دور میں کچھ نرم دل قریشی خفیہ طور پر اپنے رشتہ داروں کو کھانا پہنچاتے تھے، جن میں ہشام بن عمرو اور حکیم بن حزام نمایاں ہیں، لیکن عمومی طور پر یہ تین سال اسلامی تاریخ کے سخت ترین سالوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ابو طالب، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور دیگر بزرگوں کی صحت اسی دور میں سخت متاثر ہوئی۔ اس کے باوجود حضور ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے نہ دعوت میں کمی کی اور نہ صبر کا دامن چھوڑا۔ اشہر حرم میں آپ ﷺ باہر نکل کر لوگوں کو دعوت دیتے رہے اور حج کے موسم میں قبائل تک اسلام کا پیغام پہنچتا رہا۔

مقاطعے کا خاتمہ اور اس کے اثرات

دس نبوی میں چند انصاف پسند قریشی سرداروں، ہشام بن عمرو، زہیر بن ابی امیہ، مطعم بن عدی، ابو البختری اور زمعہ بن الاسود، نے اس ظالمانہ معاہدے کے خاتمے کی تحریک چلائی۔ انہوں نے کہا کہ یہ قطعی رشتہ داری اور ظلم کی انتہا ہے کہ ہمارے عزیز بھوکے مریں اور ہم دسترخوانوں پر کھانا کھائیں۔ جب معاملہ کعبہ میں پیش ہوا تو ابو طالب نے اطلاع دی کہ اللہ تعالیٰ نے اس صحیفے کو کیڑے) ارَضہ (کے ذریعے کھا دیا ہے اور اس میں صرف اللہ کا نام باقی رہ گیا ہے۔ صحیفہ کھول کر دیکھا گیا تو واقعی سوائے' باسمک اللھم 'کے تمام تحریر ختم ہو چکی تھی۔

اس کے بعد مقاطعہ ختم ہوا اور اہل شعب واپس اپنے گھروں کو آئے۔ اس واقعے کے اثرات دور رس تھے :قریش کے اپنے اندر انصاف و ظلم کی تقسیم واضح ہو گئی، حضور ﷺ کے صبر و استقامت نے عربوں کے دلوں میں آپ کا وقار بڑھا دیا، اور یہ ثابت ہو گیا کہ دعوت کو معاشی و سماجی دباؤ سے دبایا نہیں جا سکتا۔ تاہم اسی سال ابو طالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا جس کی وجہ سے اس سال کو' عام الحزن' کہا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد طائف کا سفر اور پھر معراج کا واقعہ پیش آیا۔

حصہ دوم :بیعت رضوان — پس منظر

چھ ہجری میں حضور ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپ ﷺ صحابہ کے ساتھ امن سے مکہ میں داخل ہو کر عمرہ ادا کر رہے ہیں۔ اس خواب کی بنا پر آپ ﷺ تقریباً چودہ سو صحابہ کے ساتھ عمرے کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ مسلمان قربانی کے جانور ساتھ لے کر اور احرام باندھ کر چلے تھے اور جنگ کا کوئی ارادہ نہ تھا، اس لیے تلواریں بھی نیاموں میں تھیں۔ قریش نے مکہ میں داخلہ روکنے کی تیاری کی اور خالد بن ولید کو دستے کے ساتھ آگے بھیجا۔ حضور ﷺ نے راستہ بدل کر حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا، جو مکہ کے قریب حرم کی حدود کے کنارے واقع تھا۔

مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ قریش کے کئی سفیر آئے اور واپس جا کر انہوں نے حضور ﷺ کے ساتھ صحابہ کی عقیدت و اطاعت کی گواہی دی۔ آخر میں حضور ﷺ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اپنا سفیر بنا کر مکہ بھیجا تاکہ وہ قریش کو بتا دیں کہ مسلمان عمرے کی نیت سے آئے ہیں، جنگ ان کا مقصد نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قریش نے روک لیا اور یہ افواہ پھیل گئی کہ انہیں شہید کر دیا گیا ہے۔ یہی صورتحال بیعت رضوان کا سبب بنی۔

بیعت رضوان کا واقعہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر سن کر حضور ﷺ ایک ببول) کیکر (کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور فرمایا کہ ہم اس وقت تک یہاں سے نہیں جائیں گے جب تک ان کا قصاص نہ لیں۔ پھر آپ ﷺ نے صحابہ کو بیعت کی دعوت دی۔ تمام صحابہ نے جوش و ایمان سے آپ ﷺ کے دست مبارک پر موت تک لڑنے اور فرار نہ ہونے کی بیعت کی۔ ایک روایت کے مطابق بیعت اس بات پر ہوئی کہ میدان سے بھاگیں گے نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے آپ ﷺ نے اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھ کر خود بیعت فرمائی اور فرمایا کہ یہ عثمان کی بیعت ہے، کیونکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے کام میں گئے تھے۔

اس بیعت کی عظمت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے قرآن مجید میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ سورۃ الفتح میں ارشاد ہے' :لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ 'یعنی اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے۔ اسی مناسبت سے اسے' بیعت رضوان 'یعنی اللہ کی خوشنودی والی بیعت کہا جاتا ہے۔ اللہ نے ان کے دلوں کے حال کو جانا، ان پر سکینت نازل فرمائی اور انہیں قریبی فتح کی بشارت دی۔ اس بیعت میں شریک صحابہ کو' اصحاب الشجرہ 'کہا جاتا ہے اور ان کی تعداد چودہ سو بیان کی جاتی ہے؛ حضور ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں میں سے کوئی جہنم میں نہیں جائے گا۔

بیعت رضوان کے نتائج اور صلح حدیبیہ سے تعلق

بیعت کی خبر قریش تک پہنچی تو انہیں مسلمانوں کے عزم و اتحاد کا اندازہ ہو گیا۔ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو رہا کر دیا اور صلح کے لیے سہیل بن عمرو کو بھیجا، جس کے نتیجے میں صلح حدیبیہ کا مشہور معاہدہ طے پایا۔ بظاہر اس معاہدے کی شرائط مسلمانوں کے خلاف معلوم ہوتی تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی صلح کو' فتح مبین 'قرار دیا۔ بیعت رضوان دراصل اس صلح کی پیش خیمہ اور اس کی نفسیاتی بنیاد تھی۔

اس بیعت کے کئی دور رس نتائج نکلے۔ اول، مسلمانوں کی اجتماعی قوت اور قیادت پر مکمل اعتماد دنیا پر ظاہر ہو گیا۔ دوم، قریش نرمی پر آمادہ ہوئے اور دس سالہ صلح کی وجہ سے دعوت کو امن سے پھیلنے کا موقع ملا؛ بعد کے دو سالوں میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد پچھلے انیس سالوں سے زیادہ ہو گئی۔ سوم، اس بیعت نے وفاداری اور قربانی کا وہ

معیار قائم کیا جو رہتی دنیا تک مسلمانوں کے لیے نمونہ ہے۔ چہارم، اسی واقعے کے بعد خیبر کی فتح اور پھر فتح مکہ کی راہ ہموار ہوئی۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ بنو ہاشم کا مقاطعہ حق کی راہ میں صبر و استقامت کی درخشاں مثال ہے جس میں تین سال کی سماجی و معاشی اذیت ایمان کو متزلزل نہ کر سکی، اور بیعت رضوان قیادت سے بے لوث وفاداری اور اللہ کی رضا کے حصول کا وہ واقعہ ہے جسے خود قرآن نے سند عطا کی۔ یہ دونوں واقعات مل کر سکھاتے ہیں کہ مشکلات میں صبر اور اتحاد، اور فیصلہ کن لمحوں میں ایمان و اطاعت کا مظاہرہ ہی وہ حربے ہیں جن سے اللہ کی نصرت اور فتح مبین حاصل ہوتی ہے۔

سوال نمبر 20) 4 نمبر(

سوال نمبر :4 نبی کریم ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ کی وضاحت کریں نیز بتائیں کہ خدمتِ خلق میں آپ ﷺ کا رویہ کیسا تھا؟ تفصیل سے لکھیں۔

تعارف

نبی کریم ﷺ کی بعثت کا ایک بنیادی مقصد اخلاق کی تکمیل تھا۔ آپ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا' :انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق 'یعنی میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اخلاق کی عظمت پر گواہی دیتے ہوئے فرمایا' :وانک لعلی خلق عظیم 'کہ بے شک آپ عظیم اخلاق پر فائز ہیں۔ اس سوال کے دو حصے ہیں :پہلے حضور ﷺ کے اخلاق کریمانہ کی عمومی وضاحت، اور پھر یہ کہ خدمت خلق میں آپ ﷺ کا رویہ کیسا تھا۔ دونوں مباحث تفصیل سے پیش کیے جاتے ہیں۔

اخلاق کریمانہ کا مجموعی تصور

اخلاق کریمانہ سے مراد وہ بلند و شریف صفات ہیں جو انسان کو اس کے خالق اور مخلوق دونوں کے نزدیک محبوب بناتی ہیں۔ حضور ﷺ کی ذات میں یہ صفات اپنے کمال کو پہنچی ہوئی تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کے

اخلاق کا جامع تعارف ان الفاظ میں کرایا' :کان خلقه القرآن 'آپ ﷺ کا اخلاق قرآن تھا، یعنی قرآن جن صفات کا حکم دیتا ہے اور جن برائیوں سے روکتا ہے، آپ ﷺ کی زندگی ان سب کی عملی شکل تھی۔ آپ ﷺ کا اخلاق موسمی یا مصلحتی نہ تھا؛ دوست و دشمن، امیر و غریب، خلوت و جلوت، جنگ و امن، ہر حالت میں آپ ﷺ کا کردار یکساں بلند تھا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال حضور ﷺ کی خدمت کی، آپ نے کبھی مجھے اف تک نہ کہا، نہ کبھی کسی کام پر فرمایا کہ تم نے یہ کیوں کیا یا یہ کیوں نہ کیا۔ آپ ﷺ سب سے زیادہ حیادار، سب سے زیادہ سخی اور سب سے زیادہ شجاع تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کو لوگوں میں سب سے زیادہ کشادہ سینہ، سب سے زیادہ سچی زبان اور سب سے زیادہ نرم طبیعت قرار دیتے ہیں۔ یہ شہادتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ اخلاق کریمانہ آپ ﷺ کی شخصیت کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔

اہم اخلاقی صفات :صدق، امانت، صبر و عفو

صدق و امانت آپ ﷺ کی پہچان تھی۔ بعثت سے پہلے ہی قریش آپ کو صادق و امین کہتے تھے اور اپنے قیمتی سامان آپ کے پاس امانت رکھتے تھے، حتیٰ کہ ہجرت کی رات جب آپ کی جان کے درپے دشمن تھے، آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امانتیں ان کے مالکوں تک پہنچانے کی ذمہ داری دے کر روانہ فرمایا۔ دشمن کی امانت کی حفاظت اس حالت میں کرنا اخلاق کی معراج ہے۔ صبر میں آپ ﷺ کا کوئی ثانی نہیں؛ مکہ کے تیرہ سال کے مظالم، طائف کے پتھر، احد کے زخم، بھوک و فاقے، ہر حال میں آپ ﷺ نے صبر و رضا کا مظاہرہ کیا۔

عفو و درگزر آپ ﷺ کی طبیعت ثانیہ تھی۔ فتح مکہ کے دن جب وہ سب لوگ آپ کے سامنے تھے جنہوں نے آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر بے پناہ مظالم کیے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا :آج تم پر کوئی ملامت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔ وحشی، جس نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا، اور ہند سمیت سب کو معاف کر دیا گیا۔ غیظ و غضب پر قابو، دشمن کے لیے دعا اور بدلے کے بجائے اصلاح کی فکر، یہ وہ اخلاق کریمانہ ہے جس نے دلوں کو فتح کیا، اور اکثر مظالم کرنے والے بعد میں اسلام کے جانثار بن گئے۔

شجاعت، عدل، سخاوت اور رحم دلی

شجاعت میں آپ ﷺ سب سے آگے تھے۔ حنین کے معرکے میں جب لشکر بکھر گیا تو آپ ﷺ ثابت قدم رہ کر آواز دیتے رہے کہ میں نبی ہوں، جھوٹ نہیں۔ مدینہ میں رات کو کوئی آواز سنائی دیتی تو لوگ گھبرا کر نکلتے اور دیکھتے کہ حضور ﷺ سب سے پہلے موقع پر پہنچ کر واپس آ رہے ہیں۔ عدل و انصاف میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا؛ محزومی عورت کے معاملے میں سفارش پر آپ ﷺ کا چہرہ مبارک غصے سے سرخ ہو گیا اور اصول کو ہر بڑے چھوٹے سے بالاتر رکھا۔

سخاوت کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ کے پاس جو کچھ آتا محتاجوں میں تقسیم کر دیتے، خود فاقے تک گزار لیتے اور گھر میں رات کو کچھ ذخیرہ رکھنا پسند نہ فرماتے۔ ایک بار ایک شخص نے بکریوں کا اتنا بڑا ریوڑ مانگا جو دو پہاڑوں کے درمیان کی وادی بھرتا تھا، آپ ﷺ نے عطا فرما دیا، وہ شخص اپنی قوم کے پاس جا کر کہنے لگا کہ اسلام قبول کر لو، محمد ﷺ اس طرح دیتے ہیں کہ فقر کا خوف ہی نہیں رکھتے۔ رحم دلی کا دائرہ انسانوں سے بڑھ کر جانوروں تک وسیع تھا؛ آپ ﷺ نے جانوروں پر بوجھ کم کرنے، ان کے چارے کا خیال رکھنے اور بلاوجہ تکلیف نہ دینے کا حکم دیا۔

خدمت خلق میں حضور ﷺ کا رویہ: اصول

اب سوال کے دوسرے حصے کی طرف آتے ہیں۔ خدمت خلق آپ ﷺ کے اخلاق کا عملی رخ تھا۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے' :خیر الناس انفعهم 'لوگوں میں بہتر وہ ہے جو لوگوں کو سب سے زیادہ نفع پہنچائے، اور' اچھے لوگ اللہ کے نزدیک وہ ہیں جو اس کی مخلوق کے لیے سب سے زیادہ مفید ہوں'۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی مدد میں رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے۔ ان اصولوں کو آپ ﷺ نے صرف زبانی نہیں سکھایا بلکہ اپنی زندگی کے ہر دن پر عمل کر کے دکھایا۔ آپ ﷺ کے نزدیک خدمت کسی طبقے تک محدود نہ تھی؛ یتیم، بیوہ، مسکین، بیمار، مسافر، غلام، پڑوسی، حتیٰ کہ غیر مسلم شہری بھی آپ کی خدمت و شفقت کے حقدار تھے۔

خدمت خلق کی عملی مثالیں

مدینہ کی ایک بوڑھی عورت کی خدمت کرنے والے غلام کے واقعے میں اور اس یہودی لڑکے کی عیادت میں، جو آپ ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا، آپ ﷺ کے رویے کی جھلک ملتی ہے۔ آپ ﷺ بیماروں کی عیادت کو عبادت قرار دیتے، جنازوں میں

شرکت فرماتے، دعوت قبول کرتے خواہ غریب کی ہو، غلام کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور اپنے کام خود کرتے :کپڑوں کی مرمت، جوتوں کی سلائی، بکری کا دودھ دوھنا اور گھر کے کاموں میں اہل خانہ کا ہاتھ بٹانا آپ ﷺ کی عادت تھی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مدینہ کی ایک لونڈی آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑ کر جہاں چاہتی لے جاتی اور آپ ﷺ اس کا کام کر کے واپس آتے۔

سماجی سطح پر خدمت خلق کی مثالیں اور بھی درخشاں ہیں۔ بیواؤں اور یتیموں کی کفالت کو آپ ﷺ نے جہاد فی سبیل اللہ کے برابر قرار دیا۔ اصحاب صفہ کے فقراء کی خبر گیری کا خاص اہتمام تھا؛ جو ہدیہ آتا وہ صفہ کے غریبوں کو بھیجا جاتا اور خود صدقہ قبول نہ فرماتے۔ قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک ، قیدیوں کو کھانا کھلا کر خود بھوکا رہنے کی بدر کی مثالیں، اور غلاموں کی آزادی کی ترغیب، یہ سب خدمات اسی رویے کا اظہار ہیں۔ پڑوسی کے حقوق پر اتنی تاکید فرمائی کہ حضرت جبریل کی مسلسل وصیت پر آپ ﷺ کو گمان ہوا کہ پڑوسی کو وارث ہی قرار دے دیا جائے گا۔ راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانا صدقہ قرار پایا، اور مسکرا کر ملنا بھی صدقہ ٹھہرا، یوں خدمت کا دائرہ ہر چھوٹے بڑے عمل تک پھیلا دیا گیا۔

خدمت خلق کے نتائج اور آج کے لیے سبق

اس رویے کے نتائج یہ نکلے کہ مدینہ کا معاشرہ بھائی چارے، قربانی اور باہمی تعاون کا نمونہ بن گیا۔ انصار نے مہاجرین کو اپنے مال و گھر میں شریک کیا، کیونکہ انہوں نے اپنے نبی ﷺ کو خدمت کرتے دیکھا تھا۔ قیادت کو خدمت کے طور پر پیش کرنے کا یہی تصور بعد میں خلفائے راشدین کی زندگیوں میں جاری رہا؛ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا راتوں کو گشت کر کے بھوکوں کو کھانا پہنچانا اسی اسوے کی پیروی تھی۔

آج کے دور میں اس اسوے کی ضرورت شدید ہے۔ ہمارا معاشرہ خود غرضی، مادیت اور بے حسی کا شکار ہے۔ طالب علم کے لیے سبق یہ ہے کہ خدمت خلق کو صرف بڑے منصوبوں کا نام نہ سمجھا جائے بلکہ روز مرہ کی چھوٹی نیکیوں سے آغاز ہو :بیمار کی عیادت، غریب کی مدد، پڑوسی کی خبر گیری، یتیم کی کفالت اور والدین و اساتذہ کی خدمت۔ جس معاشرے میں یہ رویہ عام ہو جائے وہاں جرائم گھٹتے ہیں، محبت بڑھتی ہے اور اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اخلاق کریمانہ قرآن کا عملی نمونہ تھے :صدق، امانت، صبر، عفو، شجاعت، عدل، سخاوت اور رحم دلی میں آپ ﷺ بے مثال تھے۔ خدمت خلق میں آپ ﷺ کا رویہ بے لوث، ہمہ گیر اور عملی تھا؛ آپ ﷺمحض تلقین نہیں کرتے تھے بلکہ خ[illegible] سے آگے بڑھ کر خدمت کرتے تھے، اور خدمت کو عظمت و عبادت کا درجہ عطا کیا۔ مسلمان کے لیے یہی اسوہ ہے کہ [illegible] اخلاق کو شعار بنائے اور خدمت خلق کو اپنی زندگی کا معمول بنا لے، کیونکہ حضور ﷺ کی پیروی کا دعویٰ عمل کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

سوال نمبر 20) 5 نمبر(

سوال نمبر :5 طلیحہ اسدی کون تھا؟ اس کے خلاف سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مہم کی اہمیت کو واضح کریں۔

تعارف

حضور ﷺ کی وفات کے بعد جزیرہ نما عرب میں اٹھنے والے ارتداد کے فتنوں میں جھوٹے مدعیان نبوت کا فتنہ سب سے خطرناک تھا، اور ان مدعیان میں طلیحہ اسدی نمایاں نام ہے۔ طلیحہ نجد کے ایک بڑے قبیلے کا سردار، مشہور شاعر اور جنگجو تھا جو نبوت کا دعویٰ کر بیٹھا۔ اس کے خلاف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مہم اسلامی ریاست کے استحکام کی پہلی اور فیصلہ کن جنگ تھی۔ اس جواب میں پہلے طلیحہ کا تعارف، پھر اس کی بغاوت، مہم کے واقعات اور آخر میں اس مہم کی اہمیت کو واضح کیا جائے گا۔

طلیحہ اسدی کون تھا؟

طلیحہ بن خویلد اسدی قبیلہ بنو اسد سے تعلق رکھتا تھا، جس کا مرکز نجد کا علاقہ تھا۔ وہ عرب کے مشہور شعرا اور بہادر جنگجوؤں میں شمار ہوتا تھا اور اپنی قبائلی قیادت و شاعری کی وجہ سے وسیع اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ اس کی شخصیت میں وہ تمام عناصر موجود تھے جو قبائلی معاشرے میں قیادت کی بنیاد بنتے تھے :نسب کی شرافت، شعر کا

تبحر، جنگی مہارت اور خطابت کا جادو۔ اس لیے جب اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تو بہت سے قبائل اس کے گرد جمع ہو گئے۔

نبوی دور کا ایک واقعہ طلیحہ کی ابتدائی صورت حال کو ظاہر کرتا ہے۔ بنو اسد کا وفد نوسنہ ہجری میں مدینہ آیا اور اسلام قبول کیا، لیکن ان لوگوں نے اس قبول اسلام کو حضور ﷺ پر احسان جتلایا، جس پر قرآن مجید) سورۃ الحجرات (17 :میں تنبیہ نازل ہوئی کہ وہ اپنے اسلام کو احسان نہ سمجھیں۔ روایات کے مطابق طلیحہ نے حضور ﷺ کی زندگی ہی کے اواخر میں مدینہ کے قریب ذوالقصہ کے مقام پر شورش برپا کی تھی اور مسلمانوں کے ایک دستے پر حملہ بھی کیا تھا۔ حضور ﷺ نے حضرت ضرار بن الازور رضی اللہ عنہ کو اس کے مقابلے پر بھیجا تھا، لیکن حضور ﷺ کی وفات کی خبر پھیلتے ہی اس فتنے کو نئی زندگی مل گئی۔

نبوت کا دعویٰ اور بغاوت کا پھیلاؤ

حضور ﷺ کی وفات کے بعد طلیحہ نے کھل کر نبوت کا دعویٰ کیا اور خود پر وحی اترنے کا اعلان کرنے لگا۔ اس نے اپنے پیروکاروں کے لیے نماز کی رکعات کم کر دیں اور سجدے کی رسم ختم کر کے کہا کہ اللہ کو تمہارے چہرے خاک آلود کرنے کی کوئی حاجت نہیں، یعنی آسانی کے نام پر دین کی بنیادوں کو بدلا۔ قبائل اسد، غطفان اور طی کے بڑے حصے اس کے ساتھ ہو گئے اور عیینہ بن حصن فزاری جیسے سردار نے اس کی حمایت کر کے بنو فزارہ کو بھی اس کے کیمپ میں شامل کر دیا۔ اس موقع پر عیینہ کا یہ قول مشہور ہے کہ غطفان کے ایک شخص کی نبوت قریش کے نبی کے بعد مجھے زیادہ پسند ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بغاوت کے پیچھے قبائلی عصبیت کارفرما تھی۔

طلیحہ نے بزاخہ کے مقام پر اپنا مضبوط مرکز قائم کیا جہاں پانی کے چشمے اور چراند موجود تھے۔ اس کے لشکر کی تعداد تیزی سے بڑھی اور مدینہ کے لیے براہ راست خطرہ پیدا ہو گیا، کیونکہ بزاخہ مدینہ کے شمال مشرق میں زیادہ دور نہیں تھا۔ خود مدینہ پر بھی ذوالقصہ کے راستے حملوں کی کوشش ہوئی، جنہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیداری و پامردی سے خود قیادت کر کے ناکام بنا دیا تھا۔ صورتحال یہ تھی کہ اگر اس فتنے کو اسی مرحلے پر کچلا نہ جاتا تو ارتداد کا سیلاب پورے عرب کو بہا لے جاتا۔

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فتنوں کے مقابلے کے لیے نہایت منظم حکمت عملی اختیار کی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے پہلے مدینہ کی حفاظت کو یقینی بنایا، پھر پورے عرب کے لیے گیارہ لشکر مرتب کیے اور ہر محاذ کے لیے الگ امیر مقرر کیا۔ طلیحہ کے محاذ کے لیے آپ نے اسلام کے سب سے ماہر سپہ سالار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا، جن کی جنگی صلاحیت اور تیز رفتاری اس مہم کے لیے ناگزیر تھی۔ لشکروں کو روانہ کرنے سے پہلے ہر قبیلے کو خطوط بھیج کر اسلام پر قائم رہنے کی دعوت دی گئی اور باغیوں کو توبہ و اطاعت کا موقع فراہم کیا گیا، تاکہ حجت تمام ہو جائے۔

حکمت عملی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حکم تھا کہ وہ راستے میں بنو طی کے عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے رابطہ کریں۔ حضرت عدی رضی اللہ عنہ کی کوششوں سے قبیلہ طی طلیحہ کا ساتھ چھوڑ کر اسلام کے کیمپ میں واپس آ گیا اور پانچ سو سوار اسلامی لشکر میں شامل ہو گئے۔ اس سیاسی و سفارتی کامیابی نے طلیحہ کا اتحاد کمزور کر دیا اور یہ ثابت کیا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی میں تلوار کے ساتھ تدبیر کو بھی برابر کا مقام حاصل تھا۔

معرکہ بزاخہ اور طلیحہ کی شکست

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اسلامی لشکر لے کر بزاخہ پہنچے، جہاں طلیحہ کا بڑا لشکر موجود تھا۔ معرکے سے پہلے ایک دلچسپ نفسیاتی واقعہ پیش آیا :عیینہ بن حصن بار بار طلیحہ کے پاس جا کر وحی کی خبر پوچھتا رہا اور طلیحہ اسے ٹالتا رہا۔ سخت جنگ جاری تھی کہ عیینہ پھر گیا اور طلیحہ نے کہا کہ جبریل آئے ہیں اور کہا ہے کہ تمہیں بھی مسیلمہ کی طرح کا انجام ملے گا۔ اس پر عیینہ نے چیخ کر کہا کہ ہاں، تم سچ کہتے ہو، تم جھوٹے ہو، اور اپنی فوج لے کر میدان سے الگ ہو گیا۔ اس واقعے نے باغی لشکر کے حوصلے پست کر دیے اور اسلامی لشکر کی فیصلہ کن ضرب نے طلیحہ کی فوج کو منتشر کر دیا۔

طلیحہ اپنی بیوی کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر شام کی طرف فرار ہو گیا اور اس کا کیمپ، مال و اسباب مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔ بنو اسد و غطفان کے قبائل نے دوبارہ اسلام قبول کر لیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ طلیحہ بعد میں اپنے جھوٹے

دعوے سے تائب ہو کر مسلمان ہو گیا اور اس نے باقاعدہ اسلام قبول کر کے عراق کی فتوحات میں حصہ لیا؛ جنگ قادسیہ اور نہاوند میں اس نے شاندار جنگی خدمات انجام دیں اور مورخین اس کی بہادری کی تعریف کرتے ہیں۔ یہ انجام اسلام کی اس پالیسی کا نتیجہ تھا کہ توبہ کا دروازہ کھلا رکھا گیا اور اصلاح یافتہ افراد کو معاشرے میں عزت کا مقام دیا گیا۔

مہم کی اہمیت

طلیحہ کے خلاف مہم کی اہمیت کئی پہلوؤں سے نمایاں ہے۔ اول، یہ ارتداد کے خلاف پہلی بڑی فیصلہ کن کامیابی تھی۔ بزاخہ کی فتح نے دیگر باغی قبائل کو واضح پیغام دیا کہ مدینہ کی ریاست کمزور نہیں اور ارتداد کا راستہ اختیار کرنے والوں کا انجام شکست ہے۔ اس کے برعکس اگر یہاں پسپائی ہوتی تو مسیلمہ اور دیگر مدعیان کے حوصلے بڑھ جاتے۔ دوم، اس فتح سے شمالی و وسطی عرب کے بڑے قبائل) اسد، غطفان، طی، ہوازن (دوبارہ ریاست کے دھارے میں شامل ہو گئے، جس سے جزیرہ نما عرب کے اتحاد کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہٹ گیا۔

سوم، اس مہم نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری کو ثابت کیا اور یمامہ کی اس سے بڑی مہم کے لیے راستہ ہموار کیا۔ چہارم، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ اصول دنیا کے سامنے آیا کہ وہ دین کے بنیادی معاملات میں کسی مداہنت کے قائل نہیں، لیکن توبہ کرنے والوں کے لیے ریاست کے دروازے کھلے ہیں؛ طلیحہ کی بعد کی شاندار خدمات اسی پالیسی کا ثمر ہیں۔ پنجم، یہ مہم نوجوان اسلامی ریاست کے لیے خود اعتمادی کا سنگ میل تھی، جس نے ثابت کیا کہ حضور ﷺ کے بعد بھی امت متحد قیادت میں بڑے سے بڑے فتنے سے نبرد آزما ہو سکتی ہے۔

آخر میں یہ بھی یاد رہے کہ اس مہم نے دعوت و سیاست کا فرق واضح کر دیا :نبوت کا جھوٹا دعویٰ محض مذہبی اختلاف نہیں بلکہ ریاست کے خلاف مسلح بغاوت تھا، جس کا مقابلہ ریاست کا فرض تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خطوط و دعوت کے بعد ہی تلوار استعمال کی، اور یہی ترتیب بعد کی تمام مہمات میں قائم رہی۔ اس لیے بزاخہ کی مہم اسلامی تاریخ میں انصاف، اصولی سختی اور تدبیر کا جامع نمونہ شمار ہوتی ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ طلیحہ اسدی بنو اسد کا سردار، شاعر اور جنگجو تھا جس نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر کے اسد، غطفان اور دیگر قبائل کو بغاوت پر اکسایا۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں بھیجی گئی مہم اور عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی سفارتی بصیرت کے امتزاج سے بزاخہ میں اسے فیصلہ کن شکست دی۔ اس مہم کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے ارتداد کے سیلاب کا رخ موڑ دیا، عرب کے اتحاد کی بنیاد مضبوط کی، اسلامی ریاست کا وقار قائم کیا اور توبہ و اصلاح کا دروازہ کھلا رکھ کر تاریخ میں ایک نیک نظیر قائم کی۔ خود طلیحہ کا بعد میں مخلص مسلمان اور مجاہد بن جانا اس مہم کی کامیابی کا سب سے روشن ثبوت ہے۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com